

گھوڑے کی نانگیں ایک عجیب سے زاویے پر اکڑی ہوئی تھیں.. جیسے
 لکڑی کا ہو.. کھلونا ہوا اور کسی بچے نے اُسے گرا دیا ہو..
 دوسری سیرھی پر ٹھہری ہوئی چاندنی کے کچھ ذرے دھیرے دھیرے
 اُترتے گھوڑے کے ڈھانچے کو تاریکی میں سے الگ کرتے تھے..
 پسلیاں گوشت سے عاری نگی ہو رہی تھیں جیسے وہ کسی قصاص کی دوکان
 پر پڑا ہو.. ان میں سے تراشے ہوئے پارے کچھ لگلے گئے تھے اور کچھ قے کے
 ساتھ باہر آگئے تھے اور اب اُس کی سرد ہو چکی لید پر اکڑے پڑے تھے..
 جانی کا زخم خورده وجود بھی اس کے گرم پیشاب سے کچھ شفایاں ہوا تھا
 مگر یہ عارضی آرام تھا، اذیت پھر سے لوٹ آئی تھی اور ٹیسوس کی مویں بدن میں
 بھرتی تھی.. بھوک کا تیزاب اس کی انتزیوں کو اور اُس کے بدن میں جتنی بھی
 شریانیں اور ریگیں تھیں انہیں گلا کر ریزہ ریزہ کر چکا تھا.. کوئی واضح بدنی نظام باقی
 نہ رہا تھا.. گوشت کی ایک دلدل تھی جس میں سے خون جانے کیسے راستے تلاش
 کر لیتا تھا جو ابھی تک روائی تھا.. تھوڑی سی خوراک اس گوشت کی دلدل
 کو پھر سے زندگی دے سکتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ گھوڑے کو نہیں کھا سکتا
 تھا.. تہہ خانے کے باقی پناہ گزیں بھی کہیں نہ کہیں ادھ مونے یا جانے پورے
 مونے ہوئے پڑے تھے..

جانی نے بمشکل اپنا ہاتھ اٹھا کر گھوڑے کی پشت پر رکھا.. اُسے تھپکا۔
”سوری.. میں نے تمہیں شوٹ کیا۔“

اس تھپکی سے گھوڑے کا بدن تھر تھر لایا نہیں.. جیسے کہ اس کے براوی کا
بدن اس کے ہاتھ کے لمبے کو محسوس کرتے ہی تھر تھرانے لگتا تھا.. وہ برف
ٹھنڈک میں اکڑا ہوا مردہ تھا۔

”ہاں.. میں نے تمہیں شوٹ کیا لیکن.. میں تمہیں کھاؤں گا نہیں..“
اوپر.. تہہ خانے کے اوپر قلعہ جنگل کے وسیع صحن کی گرد میں اٹی جتنی
بھی لاشیں اکڑی پڑی تھیں، ان میں سے بے شمار سر بریدہ تھیں۔ ان میں سے
ایک کا سر اس کے آس پاس نہیں گرا تھا، دھماکے سے بہت دور ایک گڑھے میں
جا گرا تھا.. وہ ایسے زاویے پر اٹکا ہوا تھا جیسے عجائب گھر میں دھڑ سے الگ بدھا کا
کوئی سر نمائش پر ہو.. البتہ اس کا چہرہ بدھا کی مانند صاف سترانہ تھا.. نین نقش
 واضح نہیں تھے۔ ان پر خون کی پپڑیاں جھی تھیں اور گھاؤ تھے.. البتہ اس کے ہونٹ
باقیہ چہرے سے الگ صاف دکھائی دے رہے تھے.. یہ ہونٹ مکر چاندنی میں واضح
نظر آ رہے تھے اور یہی ہونٹ شادِ دوا ہوئے.. میرا دھڑ بیکار پڑا ہے جانی.. تم مجھے
کھا سکتے تھے.. میرا تمہارا تو کوئی رشتہ نہیں.. جیسا کہ براوی کے ساتھ تھا.. تم نے
تو آج تک مجھے دیکھا بھی نہیں تو تم مجھے کھا سکتے تھے.. مجھے نہیں میرے باقیہ دھڑ
کو جو میں نہیں جانتا کہ کہاں پڑا ہے.. اور اس دھڑ کو بھی علم نہیں کہ جس سر کے
پاس اسے متھر ک اور زندہ رکھنے کی بائیکیں تھیں، وہ کہاں ہے.. سنتے ہو جانی..
بیچ تہہ خانے میں جانی نے سنا نہیں..

ہونٹ بڑی بڑاتے رہے.. تم مجھے کھا سکتے تھے.. تم مجھے..
ان کی آواز خود اس سر کے کان نہیں سن رہے تھے تو تہہ خانے میں پڑا
جانی کیسے سن لیتا..

لئنے روز ہو گئے تھے وضو کئے ہوئے.. نماز کی نیت کئے ہوئے.. اپنے آپ کو مصقا کئے ہوئے.. جانی کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال اس کے بالوں میں الجھتے تھے اور اگر اس کی داڑھی ایک مٹھی میں بچپنی جاتی تو بھی اس کے بال اس سے باہر ہوتے.. اور وہ ایک محور شخص کی مانند گھوڑے کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے سہلا تھا.. میں تمہیں کھاؤں گا نہیں..

گھوڑا اسی طرح اکڑا ہوا لکڑی کا زمین پر گرا ہوا کھلونا رہا.. لیکن شامداں نے تھوڑی اٹھائی.. گردن سیدھی کی.. ایال کے بال جیسے ہوا کے ایک نامعلوم جھونک سے سرسرائے.. جانی میں جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں نہیں کھا سکتے.. جانی کے بدن میں اذیت کا جو قیمة تھا.. انتزیاں، رگیں، شریانیں جو کچھا مچھا ہو چکی تھیں، وہ سب مجمع ہو کر حیرت میں ہو گئیں کہ ایک مرد ہوا.. اکڑا ہوا.. بدن دریدہ گھوڑا.. اس کا بچا کھپاڑا ہانچہ کیسے بول سکتا ہے... لیکن اسی حیرت نے نیم مردی کے باوجود ایک سوال ”کیوں؟“ کی صورت میں کیا..

”میں وہی پونی ہوں.. تمہارا پیارا، پسندیدہ براومنی جس پر تم سواری کیا کرتے تھے.. جس کی پشت تھکتے تھے.. اور تمہاری ہتھیلی تلنے میرا بدن خوش ہو کر تھرھراتا تھا.. میں وہی ہوں.. تم مجھے چھوڑ کر یہاں چلے آئے تو میں بھی تمہیں سوگھتا یہاں تک چلا آیا.. جانی اگر.. فرض کرو کہ اگر.. تم پھر سے اپنے گھر پہنچ جاؤ.. دیسے ہو جاؤ جیسے تمہاری نسل کے دوسرا نوجوان تھے تو کیا پھر بھی تم یہاں آنے کا فیصلہ کرو گے..“

”ہاں...“

”تمہیں کوئی پچھتاوا نہیں؟“

”نہیں..“

”تم زندگی میں پہلی بار نگے پاؤں ہو.. تمہارے تکوے زخمی اور پیپ سے

بھرے ہیں.. ملیشے کی شلوار قمیض تمہارے بدن سے یوں چپ چکی ہے کہ اسے
اتارو گے تو تمہاری جلد بھی اس کے ساتھ اترتی چلی جائے گی.. تمہارا سیاہ رنگ کا
سویٹر جسے ہوئے خون سے اکڑا ہوا ہے.. تم پر لال بیگ رینگتے ہیں اور بالوں میں
جو میں سرسراتی ہیں اور تمہاری حالت مردوں سے بدتر ہے.. پھر بھی کوئی قلق
نہیں..”

”نہیں..“

قلعہ جنگی کے صحن میں اتری ہوئی مکر چاندنی بھی بیزار ہوئی اور تمہ
خانے کی تیسرا سیڑھی پر اتر کر سرگوشی میں بولی ”نہیں؟“

”نہیں..“ جانی بڑ بڑایا اور اس کا ہاتھ گھوڑے کی پشت سے گرا اور وہ
نقابت کی تاب نہ لا کر ڈھے گیا..

گڑھے میں پڑے سر کے ہونٹ ایک مسکراہٹ میں پھیل گئے.. انہیں
زروان حاصل ہو گیا تھا..

جانی اگرچہ پوری شدت سے بڑا یا تھا.. ”نہیں“ کہا تھا اور ڈھے گیا تھا تو
یہ نہیں کہ وہ تھہ خانے کے گھپ اندھیرے میں گمنام اور چپ چاپ گرا تھا..
نہیں.. اس کے ”نہیں“ کو اُس کی پسلیوں نے جب کہ وہ فرش پر گرا تھا، سناتھا..
اور گل شیر والی کے ایک کان نے سناتھا..

اگرچہ وہ مرے ہوئے لگتے تھے لیکن نیم بے ہوشی کی غفلت بھری ایسی
نیند میں تھے جو بھوک، نقاہت اور موت کی قربت کے باعث ایک سیاہ دھند کی
مانند اترتی ہے.. اس غال مدد ہوشی میں پورا نظامِ بدن مفلوج ہو جاتا ہے لیکن سر
کے اندر دماغ کے گمشده خلیوں میں کہیں کہیں آوازیں اور زندگی کے آثار دستک
دیتے رہتے ہیں.. جیسے جان کنی کے عالم میں.. جب جان ایک بیلنے کے شکنخ میں
آئی ہوتی ہے اور نکلنے کا نام نہیں لیتی تو بدن ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن دماغ کے
خلیے مرنے سے انکار کر دیتے ہیں.. ان کی حدتِ دھیرے دھیرے سرد ہوتی ہے..
جیسے برسوں سے دھونی رمائے سادھو.. پناکھائے پئے بیٹھے رہتے ہیں، بعض معدوم
سی ہوتی ہے، زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں رہتے لیکن ان کے سر پر ہاتھ رکھا
جائے تو ہتھیلی پر دماغ کی ایک ہلکی سی دستک محسوس ہوتی جاتی ہے..
وہ سب اسی قسم کی مفلوج شدہ شیمِ مردہ حالت میں وہ دشکیں محسوس کرتے
تھے.. گل شیر والی نے بھی جانی کی ”نہیں“ کی یہ دستک اسی طور محسوس کی تھی..

دیراں دستک کے پار تھا..

دیر بہت دور تھا..

اور دور سے دشکیں آتی چلی جاتی تھیں..

دیر میں برف گرتی تھی.. تم رگڑا اور شہر دیر میں .. لیکن وہاں اتنی سردی نہیں ہوتی تھی.. دیر کے پار چترال کو جانے والا درہ لواری تو برف سے ڈھک جاتا تھا اور اس میں سے کوئی بھی گزر نہیں سکتا تھا سوائے بھیڑیوں اور چھیتوں کے .. لیکن وہاں بھی اتنی سردی نہیں ہوتی تھی .. یہ کیسا مزار شریف ہے جہاں اتنی سردی ہوتی ہے .. یارا اس تھہ خانے میں کوئی لکڑی مکڑی جلاو .. بہت سردی ہے .. یہ امریکی گورا جو ”نہیں نہیں“ کرتا، کیا پتہ مر گیا ہے۔ اس کو گھوڑوں سے کیا الفت ہے ..

بھوک سے مرتا ہے یارا لیکن اسے کھاتا نہیں ..

ایک جانور کو خدا بنالیا ہے .. ان گوروں کا کچھ سمجھ نہیں آتا .. اوہر سیاہ

پگڑی باندھ کر ہمارے ساتھ جہاد کرنے کو آ جاتا ہے لیکن گورا ہی رہتا ہے ..

یارا گھوڑا تو اچھا جانور نہیں ہے .. یہ تو بندے کو ذلیل کرتا ہے .. ساتھ

چھوڑ جاتا ہے .. جو اس کی بیٹھ پر سوار ہو جائے، اس کے ساتھ چلا جاتا ہے، کبھی مفرک بھی نہیں دیکھتا، ایسا بے وفا جانور ہے۔

اپنادیر کے نواب کے اصطبل میں بھی کیسا کیسا بے وفا گھوڑا تھا..

نواب یا تو گھوڑا کا شو قین تھا اور یا کتا کا..

عورت کا بالکل نہیں..

دن رات گھوڑا اور کتا کے ساتھ رہتا تھا..

اس نے یارا اپنا کتا کا شادی بنایا... جشن کیا.. تو پوری ریاست میں خوشی کیا
اور ہم جیسے لوگوں کو بھی مفت میں روٹی اور گوشت کھلایا.. تو گھوڑے سے تو کتا
اچھا ہے جس کی شادی پر بھوکے کو روٹی مل جاتا ہے..

جتنا اس کے ہاں کتا تھا سب کا شادی نہیں بنایا.. نہیں تو ہمیں روز رو ز
روٹی نصیب ہو جاتا..

میرا یہ جو پاؤں ہے جس میں بوٹ ہے تو پہلے نہیں تھا.. جہاد پر آیا تو ملا..
میرا پاؤں اس جو تیا چپل وغیرہ کو نہیں جانتا تھا.. ہم کو تو یارا معلوم نہیں
تھا کہ اس خانہ خراب پاؤں میں کوئی چیز پہنتا ہے.. بچپن سے ننگے پاؤں پھرتا اور
بوجھ ڈھوتا تھا.. اس لیے ہمارا پاؤں بہت بڑا ہو گیا.. میرے سر کے موافق بڑا ہو
گیا اور اس میں.. اس کا تلوے میں دراڑیں پڑ گیا جن میں بے شک کیڑا مکوڑا اگھر بنا
لے تو بھی خبر نہیں ہوتی تھی.. اللہ تعالیٰ کیڑے کو پھر میں بھی رزق دیتا ہے یہ
ہمارا ایمان ہے تو پاؤں کے تلوے میں اگر وہ اگھر بنا تھا تو اس کا رزق تھا..
میں تب کتنے برس کا تھا؟

بہت چھوٹا تھا..

ہو گا کوئی چھ سات برس کا جب برف میں چل کر.. جب میرے پاؤں کی

درائڑوں میں کیڑا لوگ اگھر بنا تھا.. تو میں اصطبل کو پہنچتا تھا..

اصطبل میں اپنا بیوڑا.. اپنا والد لوگ نواب کے گھوڑا لوگ کی لید صاف
کرتا تھا اور ان کو غسل دیتا تھا.. انہیں سُتھرا کرنے کے واسطے صابن لگاتا تھا.. خود

ہمارے گھر میں تو کبھی صابن نہیں آیا.. میرا بوڑھا والد تب مجھے بولتا تھا کہ صابن صرف گھوڑا اور کتا کو نہلانے کے لیے ہوتا ہے، انسان کے لیے نہیں.. بعد میں میں بڑا ہوا تو معلوم ہوا جھوٹ بولتا تھا، ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا صابن خریدنے کو... یا راہم مدرسہ گیا تو ادھر ہم کو صابن بھی ملا..

تو میں نواب کے اصطبل کو پہنچتا تھا برف میں اپنے پاؤں سے چل کر..
اپنا بوڑھا والد کی مدد کرنے کے لیے..

ادھر جب اس گھوڑے کا لید اور پیشاب خطا ہوا ہے تو یہ امریکی کیسے اس میں مزے کرتا تھا کہ یہ زخم کے لیے اچھا ہے.. ہم تو یار اسی لید اور پیشاب میں پیدا ہوا تھا پھر بھی ہمارا زخم تو ٹھیک نہیں ہوتا تھا.. ادھر اگر کچھ دن کے لیے فاقہ آگیا تو خیر ہے، ادھر بھی ایسا ہو جاتا تھا.. ہم کو فاقہ کا پریکش ہے یا را.. یہ باہر کا انگریز لوگ جب ہمارے بارے میں کہانی بناتا ہے تو لکھتا ہے کہ یہ پٹھان قوم بہت طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جھلتا نہیں تو اس بیٹی چوکو کیا پتہ کہ دو چار پٹھان تو ایسا ہوتا ہے پر باقی سب تو نواب اور خان کے سامنے جھلتا ہے.. ویسا ہی ہوتا ہے جیسے بنگال کا بھوکا اور غریب ہوتا ہے.. ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا.. باہر بیٹھ کر کہانی بناتا ہے۔ کبھی میرے جیسا اصطبل والا لوگ کو نہیں ملا..

میرا بوڑھا والد بھی ایسا ہی تھا.. بھوکا اور غریب.. چھ بچھ پیدا کر لیا تھا.. اس کا پیٹ بھرنے کے لیے گھوڑا کا لید اور پیشاب صاف کرتا تھا.. پھر بھی چھ پیٹ بہت ہوتا ہے، وہ بھرتا ہی نہیں.. بچھ لوگ بدجنت کھاتا بھی بہت ہے.. بھی وہ گھوڑا کا دانہ چوری کر کے لے آتا تھا تو اس اسے چوہا ہے پر ابال کر ہم کو کھلاتا تھا تو ہم مزہ کرتا تھا.. کبھی مکئی کادانہ بھی ملتا تھا..

تو میں اپنا بوڑھا والد کا مدد کرنے کو برف میں اپنے پاؤں سے چل کر اصطبل کو جاتا تھا..

بوڑھا جب تک مجھے نہیں دیکھتا تھا، کام میں جتار ہتا تھا۔ پر جب مجھے آتا دیکھ لیتا تھا تو گر جاتا تھا اور کہتا تھا بچہ ہمارا سکت ٹوٹ گیا۔ بس تھوڑا لید اور پیشاب رہ گیا ہے، اسے تم صاف کر دو۔

یارا ادھر جتنا بھی گھوڑا تھا اور بہت تھا۔ وہ مجھے لگتا تھا کہ عام گھوڑا کی نسبت زیادہ لید کرتا تھا، زیادہ پیشاب کرتا تھا۔ اور بہت گھوڑا تھا۔ بے وفا اور ذلیل جانور ہے یارا۔ پورا رات صفائی کرتا تھا، پھر بھی لید ختم نہیں ہوتا تھا۔ اصل بل کے آخر تک صفائی کرتا تھا تو پچھلے والا حرامی گھوڑا پھر لید کر دیتا تھا۔ جھاڑو ٹوٹ جاتا تھا تو پھر ہاتھ سے اسے صاف کرتا تھا۔ ہفتے میں صرف ایک جھاڑو کا اجازت تھا۔ وہ ٹوٹ جاتا تو پھر اور کیا کرتا۔ ہاتھ سے کرتا۔ ویسے اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔ ہمارا گزار امزا را ہو جاتا تھا۔ اور کئی لوگ تھا جن کے پاس ایسا نوکری بھی نہیں تھا۔ پھر ہمارا بوڑھا سے ایک غلطی ہو گیا۔

بوڑھا کے دماغ میں شاید لید چلا گیا اور وہ دیوانہ ہو گیا۔ ساری عمر لید میں رہا تو خود بھی لید ہو گیا۔

ایک روز نواب کا سواری کے لیے ایک گھوڑا خوب لشکامش کا کے تیار کیا۔ اس کو کاٹھی ڈالا ہے تو مجھ سے بولتا ہے۔ ”گل شیر ولی.. یارا میں آج تک کسی گھوڑے پر نہیں بیٹھا۔ گدھے کا سواری کیا ہے۔ ٹوٹ پر بھی بیٹھا ہے، پر ایسا گھوڑا پر بھی نہیں بیٹھا۔ تو تھوڑا امزرا کرتا ہے اس پر بیٹھتا ہے۔“

”تو بیٹھو بابا۔“ میں نے ہنس کر کہا اور اس کا مدد کیا گھوڑے پر بیٹھنے کو۔ یارا میرا بوڑھا گھوڑا پر بیٹھا ہے تو بالکل نواب کی مانند بیٹھا ہے۔ بس اس کا کپڑا امپڑا کچھ گند امتداد اور پھٹا ہوا تھا، پر اس کا کمر سیدھا تھا، نواب کی طرح اور اس کا چہرے پر ایسا خوشی تھا کہ میں کیا بیان کروں یارا۔ مجھ سے کہتا ہے ”گل شیر ولی..“

یہ گھوڑا بھی کیا بلایا ہے یارا.. اس پر بیٹھ جاؤ تو نیچے کا چیز چھوٹا دکھائی دیتا ہے.. اور اترنے کو جی نہیں چاہتا..”

تھوڑی دیر بعد میں نے بولا کہ اب نیچے آ جاؤ.. تو وہ کہتا ہے، نہیں ابھی تھوڑا اور مزاكرے گا..

بس ہمارا بوڑھا سے یہی غلطی ہو گیا.. اصطبل کا منشی ادھر آگیا اور اس نے نواب کو شکایت کر دیا کہ یہ بوڑھا آپ کا گھوڑا پر سواری کرتا تھا.. نواب بن کر بیٹھا تھا.. یہی غلطی ہو گیا کہ جلدی سے نیچے نہیں اترا.. بیٹھا رہا..

اور نواب تو یارا خدا ہوتا ہے.. خدا تو معاف کر دیتا ہے پر نواب نہیں کرتا، وہ ہمارا بوڑھا سے بولا۔ ”اوے خبیث کا تخم... ہمارا گھوڑا پر بیٹھتا ہے.. اس کا بے عزتی کرتا ہے حرام کا اولاد.. اس پر ہم بیٹھتا ہے تو ہمارا وزن نہیں ہوتا، تم نوکر لوگ کا وزن ہوتا ہے اور گھوڑے پر بوجھ پڑتا ہے اور اس کا بے عزتی ہوتا ہے..“

یارا اس نے ہمارا بوڑھا کو عجیب سزا دیا.. اور ٹھیک دیا.. بوڑھا کے دماغ میں لید بھر گیا تھا.. نواب نے ہمارا بوڑھا کو کہا کہ تم گھوڑا بنو اور ہم تم پر سواری کرے گا تاکہ تمہیں معلوم پڑ جائے کہ ہمارا گھوڑا بے چارہ کا کیا حال ہوا تھا.. ہمارا بوڑھا خوشی خوشی گھوڑا بن گیا یارا.. نواب چاپک مارتا تھا تو وہ اور خوش ہوتا تھا کہ ہمارا قسم کتنا اچھا ہے کہ نواب خود چاپک مارتا ہے.. بوڑھانے اس کو میدان کا پورا چکر لگوایا اور اسے خوش کرنے کو گھوڑا کے موافق بولا بھی.. لیکن نواب خوش نہیں ہوا یارا، ہمارا بوڑھا کو نوکری سے رخصت کر دیا...

گھر میں جو بچہ لوگ تھا، اس کے پیٹ میں جو گھوڑا کا دانہ جاتا تھا، وہ بند ہو گیا.. ہمارا بوڑھا بھی نوکری کے ساتھ ہی تھوڑا دن میں رخصت ہو گیا۔ پر اس نے اپنا موت سے ایک دن پہلے بولا تھا۔ ”یارا گل شیر.. نواب کہتا تھا کہ اس کا وزن

نہیں.. پر جب وہ گھوڑا بنا کر میری پشت پر بیٹھا ہے تو یار اس کا توکل جہان سے زیادہ وزن تھا.. جھوٹ بولتا تھا۔“

چھ بچے میں سے ہم تیسرے نمبر پر آیا تھا.. دو بہن تھا جس کو امام نے شادی کے لیے نجی دیا اور اس کا پیسہ ہمارے پیٹ میں ڈال دیا... پھر بھائی لوگ ادھر ادھر ہو گیا.. ایک کراچی نکل گیا اور اس کا چوکیداری کا توکری لگ گیا.. دوسرا لاہور میں دانے کا بھٹی دھکلیتا تھا.. دونوں اچھا کماں کرتا تھا، پر ادھر گھر کو کچھ زیادہ مدد نہیں کرتا تھا.. اور تیسرا بھائی امام کی گود سے الگ نہیں ہوتا تھا، اس کا لاڈلا تھا۔ وہ لاڈپیار سے اور تھوڑا بھوک سے لاغر ہو کر مر گیا..

میرا کیا ہوا؟

میرا یہی ہوا جو ہو رہا ہے..

یار اہمارے برابر میں سو سال کاریاست تھا... بلکہ دیر کے راستے میں پڑتا تھا۔ ادھر بھی ہم جیسا لوگ کا قبیلہ برادری تھا۔ پران کا والی بادشاہ کوئی نیک اور بہت سینا بزرگ تھا.. نیانیا کام کرتا تھا.. اس نے ادھر سکول، کالج، ہسپتال کھولا.. سڑک بنایا.. ادھر ہمار انواب تو صرف کتنا کی شادی پر کھانا کھلاتا تھا.. لواری کا دوسرا طرف چڑال میں بھی مہتر لوگ نے اچھا کام کیا لیکن ادھر دیر میں ہم ویسا کا ویسا ہی رہا جیسا سینکڑوں سال سے تھا.. اور ہمارا ریاست سو سال اور چڑال کی نسبت کیا خدا کی شان ہے یار، مقابلہ ہی نہیں تھا حسن کا.. ایسا جنگل تھا دیر میں کہ دن کے نائم بھی اس میں اندھیرا رہتا تھا۔ ایسا ندی کا پانی تھا کہ شیشہ کا مقابلہ کرے اور ایسا وادی اور کوہ سار تھا کہ کیا مثال ہے.. پر ہم ویسا کا ویسا ہی رہا..

پھر وہاں ایک صوفی مولوی کا بڑا شہرت ہو گیا.. بڑا مشہوری بن گیا ہر طرف.. اس نے سب روڈ بلاک کر دیا.. دڑھا لائنڈ بند کر دیا کہ یا تو شریعت ہو گایا شہادت ہو گا.. اس سے تو یار اپراؤ گورنمنٹ ڈر تھا.. ولی اللہ تھا تو ڈر تھا ان.. اور

بڑا بروزست تقریر کرتا تھا.. دیر میں بھی اس کا بہت مرید تھا.. ہم بھی اس کا ایک جلسہ میں شامل ہوا تو یار اہم اور ادھر پکھل گیا اور ہم مومن ہو گیا..

اس جلسے میں کسی نے پوچھا کہ مولوی صاحب ادھر پاکستان کا بھی تو فکر کرو، یہ ختم ہو گیا تو پھر ہم کیا کرے گا تو مولوی نے ایسا جواب دیا کہ سب لوگ نعرہ بکیر بلند کرنے لگا.. اس نے کہا، ہمیں پاکستان نہیں اسلام چاہیے.. بے شک پاکستان پر ہندوستان قبضہ کر لے تو یہ اچھا ہو گا کیونکہ پھر ادھر کا پندرہ کروڑ مسلمان اس کے خلاف جہاد کرے گا تو وہ نکڑے نکڑے ہو جائے گا.. کیا اول نمبر جواب دیا ہے یارا.. تو ہمارا دل پکھل گیا اور ہم اس کا ایک مرید کا مرید ہو گیا.. ادھر کھانا ملتا تھا، کپڑا ملتا تھا اور شہادت کی برکات پر تقریر ملتا تھا..

مولوی ہم سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں جو طالبان کی مدد نہ کرے.. یارا ہمارے پاس تو اور کچھ تھا نہیں صرف مسلمانی تھا تو اسے ضائع نہیں کرنا تھا... امریکہ نے جنگ شروع کیا تو مولوی نے لشکر بنایا.. کیا جذبہ تھا یارا.. اس نے دس ہزار مجاہد تیار کیا جس میں بہت ہمارے بوڑھا کی طرح کا بھی تھا لیکن باقی لوگ ہمارے موافق جوان لوگ تھا.. بھوک، پیاس اور نیند ختم ہو گیا.. ہم دن رات ایسا نعرہ لگاتا تھا کہ گلا بیٹھ گیا.. ہمارے پاس ہتھیار تو بہت تھا مگر کم ہو گیا تو مولوی نے کہا، تم لوگ مومن ہے، تلوار سے جہاد کرے گا..

یار امیرے حصے میں ایک تلوار آیا..

ہم اس سے تربوز کاٹتا تھا اور کہتا تھا، ہم امریکی نامرد کو ایسے کاٹے گا.. لشکر کے ساتھ ہم بارڈر کے پار آیا تو طالبان لوگ نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا یارا.. ایک وقت کھانا کھلایا اور پھر جواب دے دیا کہ ہم پہلے سے مصیبت میں ہے، تم کدھر آگئے ہے واپس جاؤ.. ہم نے کہا، واپس نہیں جائے گا تو انہوں نے کہا، پھر ادھر تلوار نہیں چلے گا۔ اگر کچھ کرنا ہے تو یہ بندوق چلاو..

یارا ہم پٹھان تو تھا مگر بندوق چلانا تو دور کا بات ہے، کبھی اس کو پکڑا بھی نہیں تھا.. سب پٹھان بندوق نہیں چلا سکتا۔ صرف باہر کا لوگ یہ سمجھتا ہے.. بندوق چلانے کے لیے پیسہ چاہیے اور یارا، لید اور پیشاب صاف کرنے سے اتنا پیسہ نہیں ملتا.. تو ہم نے دو چار دن ٹریننگ کیا اور سیکھ گیا.. کچھ نہ کہا، ہم توار سے لڑے گا..

قدوز میں ہمارا بہت لوگ شہید ہوا.. توار والا جتنا تھا، وہ سب شہید ہوا.. وہ نعرہ تو ایسا لگاتا تھا کہ شیر کے مواقف لگتا تھا لیکن خندق سے نکلتا تو واپس خندق میں آگرتا تھا.. مولوی اپنا بیٹا اور رشتہ دار کو ساتھ لے کر ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا.. اس کے ساتھ تمیں کے قریب لوگ تھے.. ہمیں کچھ نہیں بتایا اور.. چلا گیا..

یارا ہم کیا کرتا.. اوپر سے بم گرتا تھا.. ہمارے سے بہت دور گرتا تھا تو ادھر ہمارے کان اور منہ سے اور ناک سے خون نکلنے لگتا تھا.. اتنے زور کا دھماکہ کرتا تھا.. سامنے سے اتنی گولی آتا تھا کہ ہم سر اٹھاتا تھا تو اس میں لگتا تھا.. ہم کیا کرتا.. ہم نے ہتھیار ڈال دیا..

یہ جو شمال والے ہیں.. تاجک.. ازبک اور ہزارے ہیں، کچھ طالبان سے تبدلہ لیتے تھے اور بیشتر کو گلے لگا کر برابر میں بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو ہمارا بھائی ہو.. ہمارا ہم وطن ہو.. ہم تو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتے آئے ہیں.. کبھی ہم جیت جاتے ہیں اور کبھی تم.. لیکن یہ غیر ملکی یہاں کیا کرنے آئے ہیں... ہم شائد عربیوں، مصریوں، سوڈانیوں اور پنجابیوں کو چھوڑ دیں لیکن پاکستانیوں کو نہیں چھوڑ دیں گے... یارا ہم تو پاکستان قربان کر کے ادھر آیا تھا، پھر بھی یہ ہمیں پاکستانی کہتے تھے..
مولوی صوفی.. یقیناً ولی اللہ تھا..

اسے اللہ کی جانب سے حکم ہو گا کہ تو اپنی اور قربتی ساتھیوں کی جان بچا کر ادھر سے نکل جا.. تیری قسمت میں ابھی شہادت نہیں ہے.. تو وہ نکل گیا.. اللہ نے حکم دیا ہو گا اور نہ وہ اتنا بزدل اور کمینہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمیں بے آسرا چھوڑ کر چلا جائے.. اسے اللہ نے کسی اور جہاد کے لیے سنبھال لیا ہو گا..

میرا کیا ہوا؟

میرا یہی ہوا جو ہو رہا ہے..
کیا باہر ابھی تک چاندنی کاراج ہے..?
دن ہے یارات..

باہر کچھ بھی ہو تھہ خانے کے اندر رات تھی.. گل شیر ولی کے دماغ میں ایک ہلکی سی دستک ہو رہی تھی.. جس میں دیر تھا اور بہت دور تھا.. زندگی کی رقم یہ دستک سنتی تھی لیکن بہری بن جاتی تھی..
گھوڑا اکڑا پڑا تھا..

اس کے مردہ گوشت کا ایک پارچہ گل شیر ولی کے معدے میں ابھی تک حل ہو جانے سے انکاری تھا لیکن اس کی موجودگی کی گرمی اس کے دماغ میں اتنی حدت روانہ کرتی تھی کہ وہ دستک دے رہا تھا..

یارا اس مردہ گھوڑے کا رنگ وہی ہے.. دیر کے اندر ہرے جنگلوں میں جو خزان رسیدہ پتے ہو لے ہو بلے گرتے ہیں ان کا رنگ.. اس کی پسلیاں ننگی ہو رہی ہیں لیکن اس کی پشت ابھی تک سالم ہے.. اس پر سوار ہو کر دیکھتے ہیں یارا کہ ہمارا بوڑھا کیا محسوس کرتا ہو گا جب وہ گھوڑے پر بیٹھا تھا..

گھوڑے پر بیٹھو.. گھوڑے پر بیٹھو.. دستک غالب ہو رہی تھی..
گل شیر ولی.. گھستا ہوا اپنے آپ کو دھکیلتا جیسے اس کا بھائی دانے کی بھٹی کو مشقت اور مشکل سے دھکیلتا تھا.. سرد لید اور ساتھیوں کے نیم مردہ بدنوں

پر سے گھستا گھوڑے کے قریب آیا.. ایک ناگ اٹھا کر اس پر سوار ہونے کی کوشش کی اور پھر گر گیا..

گھوڑا تو مردہ پڑا ہے یارا.. اس پر کیسے سواری کرے گا گل شیر.. ایک اور دستک ہوئی..

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پتھر ہو چکی پشت کو پیار سے تھکی دی تو اس کی تابنہ رُنگت کی جلد تھرائی.. جیسے اس میں ابھی تک زندگی کی حدت موجود ہو.. پھر اس کی تھوڑتھی کچے فرش سے اٹھی اور گل شیر کے رو برو ہو گئی.. اس میں دو بے جان شیشہ آنکھیں گل شیر کی آنکھوں کے سامنے تھیں.. اس کے نیم ماوف دماغ میں دستک کے ساتھ ایک ہلکی سی ہنہناہٹ بھی آئی۔

بے وفا جانور ہے یارا.. بے اعتبار جانور ہے.. مر جائے۔ اکثر جائے۔ آدھا کھایا جائے، پھر بھی زندہ ہو جاتا ہے اور ہنہنا تاہے.. اس پر کیا سواری کرنی.. گل شیر کا ہاتھ گھوڑے کی پشت سے پھسل کر اس کے بقیہ بدن کی مانند ڈھیر ہو گیا..

صرف اس کے دماغ کا ایک خلیہ دستک دے رہا تھا.. بے وفا جانور ہے یارا..

دھوپ تہہ خانے میں اترتے اترتے جھجک جاتی تھی..
 اس کی سفیدی میں اس خوف کی سیاہی ٹھلٹی تھی جو تہہ خانے کے گھپ
 اندھیرے میں سے اوپر آ رہا تھا..
 وہ نایناسی ہو رہی تھی کیونکہ اس کی کرنوں میں قلعہ جنگی کے کچے صحن
 سے اٹھنے والی دھول کے ذرے تیرتے تھے..
 اوپر ہوا تیز تھی..
 آج ہوا تیز تھی..
 وہ لاشوں کے دریدہ دامنوں کے پھریے لہراتی تھی اور یہ دامن بار بار
 اپنی، ہی لاشوں پر سر پڑھتے تھے۔
 پہلے جب قلعہ جنگی کا یہ صحن ننگا ہوتا تھا تو تیز ہوا چلنے سے اتنی دھول
 اٹھتی تھی کہ دن.. رات میں بدل جاتا تھا.. مگر اب سینکڑوں اکڑے ہوئے بدن
 مٹی پر پڑے اسے ڈھانپتے تھے، اس نیلے دھول کم اٹھتی تھی۔ صرف خون سے
 اکڑی ہوئی قمیضوں کے دامن ہوا میں اٹھتے تھے۔ شلواروں کے پھٹے ہوئے پائیخے
 نخنوں کے گرد پھر پھڑاتے تھے..

دھول صرف وہاں وہاں سے اٹھتی تھی جہاں جہاں لاشوں کے درمیان
 کچھ وقفہ آتا تھا.. کچھ جگہ بچتی تھی.. اور صحن میں کم ہی جگہ بچتی تھی.. یوں اب

دھول کم اٹھتی تھی..

جیسے ہر برس درخت کے تنے میں ایک ہالے کا اضافہ کر کے اس کی عمر
متعین کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہر دن لاش کے دانتوں سے ہونوں کو سکیز کر
انہیں مزید عیاں کرتا چلا جاتا ہے اور یوں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو
مردہ ہو چکے ہوئے کتنے روز ہو چکے ہیں.. کئی لاشوں کے ہونٹ اب مزید نہیں
سکر سکتے تھے اور ان کے مسوڑے عیاں ہوتے تھے۔ اگرچہ وہ بھی دھول سے
اٹے ہوئے ہوتے تھے.. اور بے حد مضحکہ خیز لگتے تھے.. کھلے دہن میں جو مٹی
گرتی تھی، خشک رہتی تھی، نمنہ ہوتی تھی.. نمی زندگی کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی
ہے..

لاشے دانت نکالے خوش سے لگتے تھے.. زبردستی ہنتے ہوئے.. کہیں وہ
دانت نکو سے ہوئے تھے جیسے جھنجلائے ہوئے ہوں اور کہیں ایک محمد شیم وا
مسکراہٹ تھی.. وہ جو چاروں شانے چت پڑے تھے، ان کی کھوپڑیوں کے بال مٹی
کے لیپ سے کانوں کی مانند ہو چکے تھے.. وہ بھی مٹی میں چہرہ دھنستے ہنتے ہی
ہوں گے۔

بہت دنوں سے بچے ادھر نہیں آئے تھے..

قلعہ جنگلی کی بلند سطح پر یہ ہموار میدان ان کی پسندیدہ پلے گرا اونٹ ہوا
کرتا تھا.. وہ سر شام مزار شریف سے نکل کر کھیتوں کے درمیان میں سے دھو میں
مچاتے، اچھتے ٹاپتے قلعہ کے دامن میں پکنچ جاتے اور پھر سانس مجمتع کر کے اسکی
ڈھلوان پر چڑھنے لگتے.. پستہ قد فصیل تک پکنچتے اور اسے پھلانگ کر صحن میں
داخل ہو جاتے اور پھر اس بچے کا انتظار کرنے لگتے جس کے پاس فٹ بال ہوتا تھا
اور وہ اسے سنبھالتا پچھے رہ جاتا تھا..

فت بال والا بچہ صحن میں داخل ہوتا تو اسے سانس درست کرنے کا

موقع بھی نہ دیا جاتا اور فٹ بال شروع ہو جاتا..

البتہ ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا..

اور کسی کے پاس بھی اس کا حل موجود نہ تھا..

گول کیپر زیادہ ہو جاتے اور کھلاڑی کم ..

اور جو گول کیپر ہوتے تھے، وہ بس گول کیپر ہی ہو سکتے تھے، یہ ان کی
محوری تھی..

یہ فٹ بال افغان شاکل تھا..

ہمیشہ سے یہ شاکل نہ تھا، بس پچھلے بیس پچھیں برسوں میں رواج پا گیا
تھا.. ورنہ پہلے تو کھلاڑی زیادہ ہوتے تھے..

انغامی میں لاکھوں کی تعداد میں بارودی سرنگیں دفن تھیں.. انہیں
بچانے والے روئی بھی تھے اور انغامی بھی لیکن انہیں سمینے والا کوئی نہ تھا..

بالغ افراد تو سنجل کے چلتے ہیں، نیچے بے دھیان ہوتے ہیں اور کبھی اپنی
جان اور اکثر اپنی ثانگ گنو بیٹھتے ہیں..

تو ایک ثانگ سے محروم ایک بچہ گول کیپر نہ ہو تو اور کیا ہو..

شاکد نہیں یقیناً دنیا بھر میں سب سے زیادہ گول کیپر نیچے افغانستان میں
پائے جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جس کا ندراج کہیں بھی نہیں ہوا..

یہ نیچے بھی بہت دن سے ادھر نہیں آئے تھے..

قلعہ جنگی کا صحن جو سر شام فٹ بال کے میدان میں بدل جاتا تھا، پچھے
روز جنگی قیدیوں سے آباد ہوا اور پھر بالکل خاموش ہو گیا.. یہاں سینکڑوں لاشیں
آباد ہو گئیں.. نیچے.. مزار شریف میں جو بڑے تھے، وہ تو اس آبادی سے آگاہ تھے،
اس لیے جب نیچے اور پر جا کر فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتے تو وہ انہیں سختی سے ڈانت
ڈپٹ کر کے روک دیتے.. جان پر اوپر اور واح کا بیرا ہے.. ان کی بدبو یہاں شہر

تک آتی ہے، اور نہیں جانا..

اس کے باوجود کئی روز سے اکتیا ہوا ایک بچہ چوری چھپے ادھر آنکلا..
ارواح بھی تو ایک مقام پر قیام کرتے اکتا گئی ہوں گی اور شائد رخصت ہو گئی ہوں ..
یہ فرمان اللہ کی منطق تھی.. اس لیے وہ بچے سے گھر سے نکلا تھا، کھیتوں میں
کو دنے اور چھلانگیں لگانے کی بجائے جھکا جھکا چلتا قلعے کے دامن میں پہنچا تھا اور
پھر سانس مجتمع کر کے اس کی ڈھلوان پر چڑھتا پستہ قد کچی فصیل تک آگیا تھا..
اس نے بہت احتیاط سے اس فصیل پر سے صحن کے اندر جھانکا تھا..

. وہاں فٹ بال کھینے کے لیے کوئی جگہ نہ پنجی تھی..

فرمان اللہ کو یہ منظر سمجھ میں نہیں آرہا تھا..

اور اس منظر میں سے اٹھنے والی بدبو تو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی..

وہاں تو کوئی روح نہ تھی.. لا شیں تھیں..

ایک افغان بچے کے لیے ایک لاش کبھی بھی کسی حیرت کا موجب نہیں
بنی.. اس کے گھر کے صحن میں.. کسی کھیت میں.. سکول کے باہر.. کوئی ایک یا کئی
لا شیں محض معمول تھیں..

سوائے ایک فرق کے..

گھر کے صحن میں جو لاش ہوتی تھی، وہ اپنی ہوتی تھی.. اپنی سے مراد کسی
عزیز، رشتہ دار یا بہن بھائی یا باپ کی.. جو دشمن کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا تھا.. دشمن
ایک نہ تھا، بدلتے رہتے تھے..

کھیتوں میں پڑی لاش لاوارث ہوتی تھی۔ کسی اور قبلے یا کسی اور خطے سے
آنے والے کی لاش اور جب اسے کتے اور گدھ نہیں کھا سکتے تھے تو اس کی بدبو
سے مجبور ہو کر اسے کسی گڑھے میں دبادیا جاتا تھا..

سکول کے باہر.. کوئی بھی لاش ہو سکتی تھی.. بالکل اپنی یا سر پر اپنی..

ہاں یہ ہے کہ اگر وہ بچہ شمال کا ہے تو پہلے روسی اسے لاشیں مہیا کر دیتے تھے، پھر طالبان نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور ان دونوں پتے نہیں کون اس فرض کو سرانجام دے رہا تھا.. لاشوں کی سپلائی میں رخنے نہیں پڑ رہا تھا.. اور اگر وہ ایک بچہ پشتون ہے تو ان دونوں شمال والے ان کے قبرستان بھر رہے تھے.. چنانچہ ایک افغان بچے کے لیے.. زندگی تو بن سکتی ہے موت حیرت کا موجب نہیں بن سکتی.. فرمان اللہ کو یہ منظر محض اس لیے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو اگاڑا گا یا دو چار لاشوں کا عادی تھا لیکن اس کے سامنے لاشوں کی تعداد اس کی سمجھ بوجھ اور حساب کتاب سے کہیں زیادہ تجاوز کر گئی تھی..

وہ اتنی زیادہ تعداد میں تھیں کہ انہیں دیکھ کر افسوس نہیں ہوتا تھا.. افسوس تو صرف اپنے کسی عزیز، رشتہ دار کی چارپائی پر پڑی ایک لاش کو دیکھ کر ہوتا ہے لیکن لاشوں کے ایک خاموش میلے کو دیکھ کر تو نہیں ہوتا.. فرمان اللہ جب کچی فصیل کے روزن سے جھانک رہا تھا تو اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اگر آج دوسرے بچے بھی آ جاتے.. ایک فٹ بال پیچ کا اہتمام ہوتا اور وہ جو فٹ بال سنبھالتا اور آتا تھا، وہ نہ بھی آتا تو یہاں متعدد فٹ بال میسر تھے..

اپنے دھڑ سے الگ کچھ سر تھے جو باسانی فٹ بال کے طور پر استعمال میں لائے جاسکتے تھے..

اگرچہ وہ اتنے مکمل فٹ بال نہ تھے کہ انہیں ٹھوکر لگانے سے وہ سیدھے سجاوروانی سے لڑھکتے جاتے کہ ان کی رومنی میں ان کی ناکیں آڑے آتیں اور وہ انک انک کر لڑھکتے.. اور یہ تو گول کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ گڑھے میں پڑے.. ایک خاص زاویے پر انکے.. عجائب گھر میں بے ایک مہاتما بدھ کی مانند بے اس سر نے لب کھولے.. فرمان اللہ سے کہا...